© rasailojaraid.com

مذہب کا تقابلی مطالعہ — کیوں اور کس طرح

از

ڈاکٹر ولفرڈ کینٹول اسمتھ۔ صدر شعبۂ دراساتِ اسلامیہ۔ جامعہ میک گل مانٹریال (کینیڈا)

مترجمہ

جناب سید مبارز الدین صاحب رفعت و جناب ڈاکٹر ابو نصر محمد صاحب خالدی

[محترم ڈاکٹر ولفرڈ کینٹول اسمتھ نے اپنا یہ مقالہ طالب علموں یا عام قاریوں کے لئے نہیں بلکہ متکلموں، فلسفیوں اور غور وفکر کرنے والوں کے لئے سپردِ قلم کیا ہے۔ اس لئے قدرتاً الفاظ ایسے استعمال کئے ہیں جو متکلموں میں معروف ہیں اور اسلوب ایسا اختیار کیا ہے جس سے مفکر مانوس۔ ہم نے ان کے اس اہم مقالے کے ترجمہ میں ان کے خیالات کی ترجمانی کی کوشش کی ہے' ان کی شرح و تعبیر نہیں کی ہے۔ توضیحی ترجمانی سے ہمارے ترجمہ میں روانی' سادگی وسلاست ضرور بڑھ جاتی لیکن اسی درجہ مصنف کے افکار و آراء میں مترجموں کے خیالات کی آمیزش بھی ہو جاتی۔ ایسی آمیزش ہمیں گوارا نہ ہوئی۔ یہ بھی پیش نظر رہے کہ مصنف کے ہر خیال سے مترجموں کا ہر طرح متفق ہونا ضروری ہے اور نہ اُن سے پوری طرح مختلف ہونا۔ ہمارا یہ خیال ضرور ہے کہ مصنفِ علام نے جو کچھ لکھا ہے وہ ہمارے لئے قابلِ غور و بحث ضرور ہے۔ — مترجمین]

انسائیکلو پیڈیا آف رلیجن اینڈ ایتھکس" کی تیرہ جلدیں (۱۹۰۸-۱۹۲۱ء اور حال میں اس کی دوبارہ اشاعت) ایک کارنامہ ہے جس سے کوئی شخص متاثر ہوئے بغیر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نہیں رہ سکتا[1]۔ یہ کتاب معلومات کا ایک بیش بہا مخزن ہے۔ اس حیثیت سے دنیا کی مذہبی تاریخ کے تمام محتاط طالب علموں کے لئے اس سے رجوع ہونا ناگزیر ہے۔ صرف اتنا ہی نہیں اس کو ایک علامت بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ پیشِ نظر موضوع کے سلسلہ میں اس کتاب کو میں[2] مغربی علمی تبحر کے پہلے مرحلہ کی انتہا کو نشان زد کرنے والی چیز بھی قرار دیتا ہوں۔ پہلے مرحلے میں واقعات وحقائق فراہم کئے گئے۔ انہیں مرتب کیا گیا اور پھر ان کا تجزیہ کیا گیا۔ کہا جا سکتا ہے کہ یہ مرحلہ "عہدِ دریافت" کے ساتھ ہی شروع ہوا۔ اس وقت مغربی نصرانیوں نے اپنی دنیا سے ابھی ابھی قدم باہر نکالا تھا۔ وہ ڈھونڈتے اور کھوج لگاتے ہوئے ماںقی دنیا تک پہنچے تھے۔ وہ نئی قوموں اور نئے مقاموں سے بتدریج واقف ہوتے ہوئے یہاں تک آئے تھے۔ یہ نئی قومیں اور نئے مقام ان کی سابقہ حدِ نظر سے بہت دور تھے۔ دوسری قوموں کے مذاہب کے متعلق جو اطلاعیں لائی گئیں، وہ پراسرار عجیب وغریب تھیں پہلے تو یہ اطلاعیں اٹکل پچو ہوا کرتی تھیں جیسی کہ سیاحوں کی کہانیاں ہوتی ہیں۔ لیکن بعد میں ایسی اطلاعیں

The Encyclopaedia of Religion and Ethics, Ed James Hastings with the assistance of A. Selbie ... and Louis H. gray (Edinbrough - 1908-21, New York 1953)

[2] مجھے امید ہو کہ اس مقالہ میں میں نے اپنے ذاتی خیالات کے اظہار کے لئے بڑی حد تک رسمی اور قدرے نرم اداراتی "ہم" کی جگہ واحد متکلم کا جو صیغہ استعمال کیا ہے اس کے لئے مجھے معاف رکھا جائے گا۔ یہ صیغہ استعمال کرنے پر میں اس حقیقت کی بنا پر مجبور ہوا ہوں کہ اس مضمون میں مسئلہ کا بڑا حصہ ضمائر کے استعمال ہی سے متعلق ہے۔ مجھے خاص طور پر اس بات کی فکر ہے کہ "ہم" کے لفظ کو مذہبی حیثیت سے کس طرح استعمال کیا جاتا ہے اور علماءِ مذہب اسے کس طرح برتتے ہیں۔ اس لئے میں نے خود اس لفظ کے استعمال سے جس حد تک ممکن تھا گریز کیا ہے۔ میں نے "ہم" کا لفظ وہیں استعمال کیا ہے جہاں میری مراد مجھ سے اور میرے قارئین سے ہے۔ میرے قارئین سے میری مراد ہے مذہب کے تقابلی مطالعے کی کسی نہ کسی شق کے ساتھی طالب علم۔ یا پھر اس سے میری مراد وہی بنی نوعِ انسان ہے جس میں میرے قاری اور میں سب ہی شامل ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

زیادہ منظم طور پر اور زیادہ تعداد میں فراہم ہونے لگیں۔ انیسویں صدی میں اس بات کی زبردست کوشش شروع ہوئی کہ اس صورتِ حال پر سنجیدگی سے غور کیا جائے اور اس پر باقاعدہ توجہ کی جائے۔ اب زیادہ سے زیادہ مواد تلاش کیا جانے لگا۔ جمع شدہ مواد کو احتیاط سے قلم بند کرنے کی کوشش شروع ہوئی۔ پھر باقاعدگی کے ساتھ اس کی تنقیح اور بالآخر اس کی تعبیر و توجیہہ ہونے لگی۔ یہ کام جامعات نے سرانجام دیئے۔ جامعات ہی نے بتدریج علومِ مشرقیہ اور علم الاقوام کے مطالعات کو قائم رکھا اور کہیں کہیں مذہب کے تقابلی مطالعے کے شعبے بھی قائم کردیئے۔

آج کل ان مطالعات میں ایک اور نمایاں ارتقا دکھائی دیتا ہے۔ یہ ارتقا جو ابھی نامکمل ہے دوسرے اہم مرحلے کی نشاندہی کرتا ہے۔ یہ مرحلہ شاید پچھلے مرحلے سے قدرے مختلف قسم کا ہوگا۔ اس قیاس آرائی سے میرا مطلب یہ نہیں کہ اس میدان میں کام کی پہلی ارتقائی صورت کا خاتمہ ہوگیا۔ ارتقا کی یہ حالت یعنی معلومات کی فراہمی، ان کی ترتیب و تقسیم اب بھی جاری ہے اور آئندہ بھی جاری رہیگی وسیع پیمانے پر معلومات کی فراہمی اور ان معلومات کی بڑھتی ہوئی صحت و صداقت، بڑھتی ہوئی پیچیدگی کے ساتھ اُن کا تجزیہ و تحلیل، بڑھتے ہوئے تبحر اور دقتِ نظر کے ساتھ اُن کی پیش کشی، یہ سب باتیں جاری رہیں گی اور انہیں جاری رہنا ہی چاہیئے۔ بہرطور میں اس بات کا قائل ہوں کہ یہ باتیں ایک دوسرے کا بدل نہ ہونے کے باوجود برتر مقام حاصل کررہی ہیں۔ ایک نئی اور بلند تر سطح پر ہمیں اپنے سامنے تلاش و جستجو اور مقابلہ و معرکہ کی ولولہ انگیز نئی سرحدیں صاف صاف دکھائی دے رہی ہیں۔

اس میدان میں ترقی کی پہلی منزل تو وہ تھی جہاں "دوسری قوموں" کے ادیان و مذاہب کے بارے میں مرعوب کن اطلاعیں بکثرت اکٹھی کی گئیں۔ اب ترقی کی دوسری منزل یہ ہے کہ اس میں وہ "دوسری قومیں" بذاتِ خود موجود ہیں۔ یہ وہی قومیں ہیں جن کے بارے میں ابتداءً معلومات فراہم کئے گئے تھے۔ یہ مواد انیسویں صدی سے لیکر پہلی عالمی جنگ تک جمع ہوتا رہا۔ لیکن بیسویں صدی اور خاص طور پر دوسری عالمی جنگ کے بعد بطور تتمہ و تکملہ اس جمع شدہ مواد میں ایک نئے عنصر کا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اضافہ ہوا۔ یہ عصر ایسا مقابلہ ہے جس کے دونوں فریق مردہ نہیں بلکہ جیتے جاگتے زندہ و سلامت ہیں یہ مقابلہ وسیع پیمانے پر ایسے اشخاص کا ایک دوسرے سے رو در رو ملنا ہو جن کے ادیان و مذاہب ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔

ایک لحاظ سے مذکورہ بالا انسائیکلو پیڈیا کے ذیل عصر حاضر کے ایسے حقائق ہیں جیسے ۱۹۳۶ء میں سر سروپلی رادھا کرشنن کا جامعۂ آکسفورڈ میں مشرقی فلسفہ کا اسپالڈنگ پروفیسر مقرر ہونا۔ یا ۱۹۵۲ء میں جامعہ میک گل میں "انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز" کا قیام۔ اس ادارے میں پڑھنے والوں کی جملہ تعداد کا نصف حصہ مسلمانوں پر مشتمل ہوتا ہے اور ایسے ہی پڑھانے والوں کی آدھی تعداد مسلمانوں کی ہوتی ہے۔ اسی طرح حال میں شکاگو کے مدرسۂ الٰہیات (ڈی وی نٹی اسکول) میں بدھ مت کے عالموں کا مدعو کیا جانا ہو اس قسم کی اور بھی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ بعض مغربی افراد اپنے پیشے کے لحاظ سے مشرق سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے اس پیشے میں مشرق کی دینی زندگی سے ربط وضبط قائم کرنا بھی شامل ہے۔ ایسے افراد سے اب یہ بھی توقع کی جانے لگی ہو کہ وہ ان حلقوں میں آتے جاتے رہیں گے جن کے متعلق وہ تصنیف و تالیف کر رہے ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ ایسے اکثر افراد ان حلقوں سے متواتر اور شخصی ربط قائم کئے ہوئے ہیں[۱]۔ جس طرح طب کے کسی گریجویٹ کو اس وقت تک علاج معالجہ کی اجازت نہیں ملتی جب تک کہ وہ اپنی نظری تعلیم کی تکمیل کسی طبیب کے زیر نگرانی عملی تربیت کے ذریعہ نہ کرلے اسی طرح جامعۂ میک گل کے شعبۂ دراسات اسلامیہ سے ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کرنے کی ایک لازمی شرط یہ بھی ہے کہ امیدوار" اپنی بالغ زندگی کے کسی نہ کسی مرحلے میں جامعۂ میک گل میں کام کرنے سے پہلے یا اس کے دوران میں یا اس کے بعد کچھ مدت اسلامی دنیا میں گذارے، قابلِ ترجیح تو یہ ہے کہ یہ مدت دو سال پر حاوی ہو۔ لیکن کسی صورت میں یہ مدت ایک تعلیمی میقات سے

---

۱ بتدریج یہ بات تسلیم کرلی گئی ہو کہ کسی مغربی جامعہ میں علومِ مشرقیہ کا شعبہ قائم کرنے کے لئے جو رقم صرف ہوگی اس کا ایک حصہ اساتذہ کے خرچ سفر کے لئے فراہم کیا جائیگا اور وہ انتظام کیا جائے گا جو اب تک بدقسمتی سے "رخصت" کہلاتا ہے ایسے اساتذہ کو مشرق تک اسی طرح رسائی حاصل ہونی چاہئے جیسے کیمیا کے پروفیسر کو کیمیا کے معمل تک ہوتی ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کم ہونی چاہیئے"۔ [۱]

اس طرح کے ذاتی روابط سے پیشہ ور طالب علم ہی متاثر نہیں ہوئے ہیں بلکہ عام طور پر پڑھنے یا غور و فکر کرنے والے عوام بھی مذہب کے تقابلی مطالعہ کی اس منزل ارتقا میں داخل ہوگئے ہیں۔ جب مذکورہ بالا انسائیکلوپیڈیا چھپا تو اس کے اور اس جیسی دوسری کتابوں کے ذریعہ یورپی اور امریکی روشن خیال طبقوں کے لئے "غیر نصرانی" دنیا سے متعلقہ معلومات فراہم ہوگئے تھے۔ روشن خیال اصحاب اور دوسرے لوگ بھی آج دیکھ رہے ہیں کہ بدھی یا مسلم ان کے ہمسائے ہیں، ان کے ساتھی ہیں یا ان کے حریف ہیں۔

کہا گیا ہے کہ مستقبل کے مورخین بیسویں صدی پر صرف اس طرح ہی نظر نہیں ڈالیں گے کہ وہ بنیادی طور پر سائنس کی کامرانیوں کی صدی ہے مستقبل کے مورخ اس صدی کو اس حیثیت سے بھی دیکھیں گے کہ اس صدی میں قومیں باہم ایک دوسرے سے قریب آئی ہیں اور اسی صدی میں پہلی مرتبہ پوری انسانیت نے ایک ملت (Community) کی صورت اختیار کی ہے۔

یہ تو ظاہر ہے کہ یہ صورت حال سیاسی، معاشرتی اور تہذیبی اہمیت کی حامل ہو لیکن کیا یہ صورت حال عملی حیثیت سے بھی اہمیت رکھتی ہے؟ کیا اس سے ادیان و مذاہب کے تقابلی مطالعے کے طریق و منہاج میں تبدیلی آگئی ہے یا وہ اس سے کچھ متاثر ہوا ہے؟ یقیناً ادیان و مذاہب کے تقابلی مطالعے کی ضرورت شدید تر ہو رہی ہے اور وہ مرکزی حیثیت اختیار کر رہی ہے اس کے

---

[۱] ماخوذ از شعبۂ اسلامیات میں پی ایچ ڈی سے متعلق یادداشت" ادارۂ دراسات اسلامیہ جولائی ۱۹۵۶ء

[۲] یہ اصطلاح یہاں مناسب طور پر انیسویں صدی کے طرز عمل کی نشان دہی کے لئے استعمال کی گئی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ میری دانست میں کسی مسلم، کسی ہندو یا کسی بدھی کو غلط طور پر سمجھنے کے لئے "غیر نصرانی" کی اصطلاح میں سوچنے سے بدتر کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔ اس منفی انداز کے تصور سے اس بات کا امکان ہے کہ دوسرے کے مذہب کی اثباتی صفت ہی سرے سے نظرانداز ہو جائے گی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

علاوہ میں اس بات کا قائل ہوں کہ ان حالات میں ہمارے کام کی نوعیت اور طریقۂ کار میں ایک بڑی تبدیلی ضرور شامل ہے اور مجھے یقین ہے کہ اس علم میں ترقی کا یہ دوسرا مرحلہ ایک ایسی تبدیلی ہے جو پچھلے مرحلے سے بہرحال بہتر ہے۔ اب ادیان و مذاہب کا مطالعہ صرف کتابوں ہی کے ذریعہ نہیں ہو رہا ہے بلکہ زندہ شخصیتوں کے ذریعہ اس علم کو حاصل کرنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ منہاج کی اس تبدیلی نے ان مطالعات کو حقیقت اور صحت سے زیادہ قریب کر دیا ہے۔ اس لحاظ سے کسی کے لئے بطور علامت اس دوسرے مرحلہ سے بہتر کارنامہ کی نشاندہی ممکن نہیں۔ یہ مرحلہ ابھی تک کسی بڑے کام پر منتہی نہیں ہوا اس میں شبہ نہیں کہ یہ مرحلہ اتنا زیادہ پیچیدہ اور اتنی زیادہ ابتدائی حالت میں ہے کہ اس کی اہمیت ہی کا اندازہ لگایا جا سکا ہے اور نہ اس کی پیچیدگیوں ہی کو واضح طور پر محسوس کیا جا سکا ہو۔ تاہم موجودہ زمانہ میں ہمارے موضوع میں اس تبدیلی نے ایک بنیادی پیش قدمی کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ ایسی صورت میں ہم پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ ہم اس ارتقا کو سمجھنے کی کوشش کریں اور اسے کامیاب انصرام کو پہنچائیں

نئی عالمی صورتِ حال ہمیں مجبور کر رہی ہے کہ ہم ادیان و مذاہب کے تقابلی مطالعہ کے لئے ذاتی و شخصی روابط پیدا کرنے کے مواقع تلاش کرتے رہیں۔ اسی چیز کو میں اس موضوع کے لازمی انسانی وصف سے تعبیر کر رہا ہوں۔ اگر ہم موثر طور پر اس سے نبٹ لیں تو میں سمجھتا ہوں کہ جس موضوع کے مطالعہ کی ہم نے جسارت کی ہے اس کا حق ادا کرتے ہوئے ہم نے ترقی کی طرف ایک نمایاں قدم اٹھایا ہے لیکن یہ کام آسان نہیں ہے۔ اس کے مضمرات کثیر اور نازک ہیں۔ مذہب جو کچھ ہے اور انسان جو کچھ ہے اور یہ دونوں باتیں آجکل ایک دوسرے سے جس طرح الجھی ہوئی ہیں اس کے پیشِ نظر دین و مذہب اور ان سے شخصیت کے تعلق کا ٹھیک ٹھیک ادراک کرنا یعنی یہ متعین کرنا کہ دین و مذہب بجائے خود کیا ہیں اور شخصیت کا اس میں کیا مقام ہے، انتہائی مشکل کام ہے۔ یہ کام انجام دینے کے لئے ہماری انتہائی کوششیں ہی ضروری نہیں ہیں بلکہ اس کے لئے محتاط علمیت اور ابداعی فکر بھی ناگزیر ہے۔

یہ مقالہ اس کام کا خاکہ پیش کرنے، موجودہ رجحانات کا تجزیہ کرنے اور ان کی طرف اہلِ علم و فکر کو راغب کرنے کی ایک ابتدائی کوشش ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مختصر طور پر بحث کا خلاصہ ضمائر کی اصطلاحوں میں یوں ہے۔ غیر مسیحی قوموں کے مذاہب کے مطالعہ کے سلسلہ میں مغربی مطالعہ و بحث کا مروجہ طرز یہ تھا کہ اسے غیر شخصی انداز میں ضمیر غیر ذوی العقول "وہ" (it) کے ساتھ پیش کیا جائے۔ حالیہ زمانے میں یہ بہتر صورت اختیار کی گئی کہ جن مذاہب کا مطالعہ کیا جارہا ہے انہیں شخصی و ذاتی بنایا جائے۔ یہ بات اس حد تک ترقی کر گئی ہو کہ اب اس سلسلہ میں جگہ جگہ ضمیر جمع برائے ذوی العقول اور غیر ذوی العقول "ان" (they) ملنے لگی ہے۔ موجودہ زمانہ میں مذاہب کا مطالعہ کرنے والا اپنے موضوع سے ذاتی طور پر وابستہ ہو جاتا ہے۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ کوئی شخص "ان" کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے ضمیر جمع متکلم "ہم" کہنے لگتا ہے۔ دوسرا قدم مکالمہ ہے جہاں "ہم" "آپ" سے مخاطب ہوتے ہیں۔ آگے اگر حسن سمع مفاہمت و مشارکت حاصل کرے تو یہ مکالمہ یوں ہو جائے گا کہ "ہم" "آپ" کے ساتھ گفتگو کر رہے ہیں اس ترقی کی انتہا وہ ہوگی جہاں "ہم سب" مل کر آپس میں ایک دوسرے سے "اپنے" بارے میں گفتگو کر رہے ہوں گے۔

اجازت دیجئے کہ میں اس بات کو تفصیل سے بیان کروں۔

(ا)

مذاہب کے مطالعہ میں پہلا اور بالکل بنیادی قدم اس اصول کو بتدریج تسلیم کر لینا تھا کہ مذہب کا مطالعہ اشخاص کا مطالعہ ہے۔ اس اصول کو نظری حیثیت سے تو ہر وقت درست مانا جاتا تھا لیکن اس کو ہر وقت پوری طرح پیشِ نظر نہیں رکھا گیا۔ انسان سے متعلق تلاش و تحقیق کے تمام گوشوں میں شاید ہی کوئی گوشہ ایسا ہوگا جو شخص کی ذات سے اتنا زیادہ وابستہ و پیوستہ ہو جتنا مذہب ہے۔ ایمان انسانی زندگی کا ایک وصف ہے "تمام مذاہب ہر صبح نئے مذاہب ہیں کیونکہ مفصل مکمل اور جامد مذاہب کا وجود اوپر کہیں آسمانوں میں نہیں ہے۔ مذہب کا وجود انسانوں کے قلوب میں ہے[1]"

---

[1] جوں جوں بحث آگے بڑھتی جائے گی یہ بات واضح ہوتی جائے گی کہ میں انسانیت دوستی (باقی ص۲۱۲ پر)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اگر بات یہی ہو تو پھر ہم ایک ایسی چیز کا مطالعہ کر رہے ہیں جس کا راست مشاہدہ نہیں کیا جا سکتا اس سلسلہ میں ہمارے ذہنوں کو بالکل صاف ہونا چاہیئے اور ہمیں جرأت سے کام لینا چاہیئے۔ ذاتی طور پر میرا عقیدہ ہے کہ یہ اصول آخر کار انسانیات سے متعلق تمام کاموں میں صحیح ثابت ہوگا۔ میں اس پر بھی ایقان رکھتا ہوں کہ اس سلسلہ میں ہمیں اندوہ گیں ہونا چاہیئے اور نہ کسی ہیر پھیر سے کام لینا چاہیئے۔ ہم ہی کو یہ فخر حاصل ہے کہ ہم بے جان اشیاء یا حیوانوں کا مطالعہ نہیں کرتے بلکہ انسانوں کی شخصی زندگی کے اوصاف کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اس کی وجہ سے ہمارا کام سائنس دانوں کے کام سے زیادہ مشکل بن جاتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی اس کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے اور ایک وقیع معنیٰ میں وہ زیادہ صحیح بھی ہوتا ہے۔ خیالات، تصورات، وابستگیاں، جذبات اور تمناؤں کا براہِ راست مشاہدہ نہیں کیا جا سکتا لیکن انسانی تاریخ میں ان کا حصہ کچھ کم نتیجہ خیز ہے اور ان کا مطالعہ ہی کچھ اہم یا کم معقول ہے[1] خیالات، تصورات اور وابستگیوں وغیرہ ماورائے ادراک امور — مجردات — سے استناد کیا جا سکتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ استناد

[1] انسانی طرزِ عمل میں قابل مشاہدہ امور کے مطالعہ کے لئے ملاحظہ ہو میری کتاب ISLAM IN MODERN HISTORY PRINCTON 1957 ص ۷، حاشیہ ۴، ۵ اور ۸۔

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ کی اس قسم کی حمایت نہیں کر رہا ہوں جس کا ادعا یہ ہے کہ مذہبی ایقان انسانی اُمیدوں اور آرزوؤں اور ایسی ہی دوسری باتوں کی ذہنی تصویر سے زیادہ کچھ حیثیت نہیں رکھتا۔ میری حجت تو یہ ہے کہ مذہبی عقیدہ کا مطالعہ اور خاص طور پر ایسے لوگوں کے عقیدے کا مطالعہ جو کرنے والے کے عقیدے سے مختلف ہو، نہ صرف خارجیات کا مطالعہ ہو بلکہ ایسے انسانی امیدوں اور آرزوؤں کے ساتھ ساتھ خارجیات کی تعبیر کا مطالعہ بھی ہونا چاہیئے۔ یہ اقتباس میرے ایک پچھلے مقالے سے لیا گیا ہے۔ جس کا عنوان ہے: "مذہب کا تقابلی مطالعہ: ایک مذہبی سائنس کے امکان اور مقصد پر کچھ خیالات"۔ جامعہ میک گل۔ شعبۂ الٰہیات۔ افتتاحی خطبات (مان ٹریال۔ ۱۹۵۰ء)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جیسا کہ چاہیئے مستحکم نہیں ہوتا۔ لیکن اس کے باوجود یہ معجزاتِ سائنس سے کچھ کم مستحکم نہیں ہیں۔ کہکشاں بہت وسیع سہی لیکن جس قدر کو میں پیش کر رہا ہوں وہ نہ صرف زیادہ اہمیت کی حامل ہے بلکہ کم از کم سائنس کی جیسی حقیقی اور بعض لحاظ سے اس سے زیادہ حقیقی ہے [1]۔

معاشرتی علوم بلکہ انسانیات سے متعلق بعض علوم کی بھی ایک بنیادی فروگذاشت یہ رہی ہے کہ ان علوم نے بعض انسانی تعلقات کے قابلِ مشاہدہ اظہارات ہی کو بجائے خود تعلق قرار دے لیا۔ بنی نوعِ انسان کے مطالعہ کا صحیح طریقہ استنباطِ نتائج ہی ہے۔

مذہب کے ظواہر یعنی رموز، ادارے، عقائد اور اعمال کو الگ جانچا جا سکتا ہے۔ اور واقعہ یہی ہے کہ حال حال تک، شاید خاص طور پر یورپ کے علمی حلقوں میں، ہو بھی یہی رہا تھا لیکن یہ چیزیں بجائے خود مذہب نہیں ہیں، مذہب کا میدان تو شاید وہ ہے جہاں یہ سب باتیں مذاہب کے ماننے والوں کے لئے معنویت رکھتی ہیں۔ مذاہب کے طالب علم نے اگر یہ تسلیم کر لیا ہے کہ اسے بنیادی طور پر مذہبی نظاموں سے نہیں بلکہ مذاہب کے ماننے والوں سے تعلق ہے یا کم از کم اسے یہ محسوس ہو جائے کہ اس کا تعلق اشخاص کی باطنی کیفیتوں سے ہے تو واقعی وہ اپنے شعبۂ علم میں ترقی کر رہا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ محسوسات کی دنیا ۔ جسے میں نے مذہب کے ظواہر سے تعبیر کیا ہے ۔ کے سلسلہ میں بہت کچھ کام ہوا ہے اور اب بھی بہت سا ابتدائی کام ہونا باقی ہے۔ فی نفسہٖ مذاہب کا مطالعہ صرف اسی صورت میں آگے بڑھے گا جب کہ ان کے ظواہر کا ٹھیک ٹھیک تعین ہو جائے۔ جوں جوں ظواہر کا ٹھیک ٹھیک علم ہوتا جائے اسی نسبت سے خود مذہب کے مطالعہ پر متواتر نظرِ ثانی ہوتی رہنی چاہیئے۔ یہاں اس سوال کو کوئی اہمیت حاصل نہیں کہ آیا یہ دونوں کام ایک ہی عالم انجام دے یا تقسیمِ کار کے اصول کے مطابق مختلف عالم یہ کام انجام دیں۔ ان دونوں کی

---

[1] خیال ہوتا ہے کہ کسی زمانے کے اس روشن اور اہم نظریے کو پھر سے کیوں نہ زندہ کیا جائے کہ حقیقت کے مراتب ہو سکتے ہیں۔ ایک زمانے تک یہ سمجھا جاتا رہا ہے کہ کوئی چیز یا تو حقیقی ہے یا غیر حقیقی اور یہ کہ درمیانی مراتب کی اس میں گنجائش نہیں۔

© rasailojaraid.com

اضافی قدر کے بارے میں جھگڑنا بھی سودمند نہیں ہوگا، کیونکہ دونوں ہی ضروری ہیں۔ کسی شخص کو جس چیز پر اصرار ہونا چاہیئے وہ وضاحتِ خیال ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ اس شعبۂ علم میں کام کرنے والے اس بات کو تسلیم کریں کہ کوئی مقالہ، کوئی کتاب، کوئی مجلسِ مشاورت یا کوئی کمیٹی تاریخِ مذاہب کے طالب سے کس حد تک اور خود تاریخِ مذاہب سے کس حد تک متعلق ہے۔ میرا یہ بھی خیال ہے کہ پچھلی صدی میں اس احساس و آگہی میں ترقی ہوئی ہے کہ مذاہب انسانی اشتراک و اشتباک کا نام ہے میرا قیاس ہے کہ مستقبلِ قریب میں یہ احساس بڑھتا ہی جائے گا۔

اس نقطۂ نظر کی بہت کچھ وضاحت کی جا سکتی ہے۔ ۱۹۳۴ء میں آرچر نے اپنی عام نصابی کتاب "ادیان جن پر لوگ جیتے ہیں"[1] شائع کی۔ یہ عنوان جاذبِ توجہ رہا۔ اگرچہ یہ طرزِ عمل آج تقریباً معیاری بن گیا ہے، لیکن انیسویں صدی کا کوئی عالم ان اصطلاحوں میں سوچتا نہیں تھا۔ پرات کی قابلِ قدر تصانیف "ہندوستان اور اس کے ادیان" (۱۹۱۵ء) اور "بدھ مت کی یاترا" (۱۹۲۸ء) نے بہت سے مغربی قارئین کے سامنے پہلی مرتبہ ان مذاہب کو زندہ حیثیت سے پیش کیا۔ کیونکہ پرات کو قدرت نے نہ صرف خاصی ذہانت ہی بخشی تھی بلکہ اُن میں غیر معمولی انسانی ہمدردی بھی ودیعت کی تھی۔[2]

---

[1] John Clark Archer "Faiths Men Line By" (New york 1939) ۱۹۳۴ء کے بعد اس کتاب کی کئی اشاعتیں عمل میں آئیں۔ اس کتاب سے پہلے لوئس براؤن کی مقبول عام کتاب Lewis Brown "The Belining world (New york 1926 اور بعض دوسری کتابوں میں نے بھی اسی نقطۂ نظر کو پیش کیا ہے۔

[2] James Bissett Parath" India and its Faiths: A Traveller's Record" (Boston and New york 1915); "A Pilgrimage of Buddhism and Buddhis Pilgrimage (New york, 1928)
پرات کو اس بات کا احساس تھا کہ اس شعبۂ علم میں وہ کسی نئی بات کی ابتدا کر رہے ہیں یہ بات ان کے مقدمے سے ظاہر ہے لیکن مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کے ذہن میں یہ واضح نہ تھا کہ یہ نئی چیز کیا ہے۔ پرات نے مشرق کے کلاسیکی ادب کی تعلیم نہیں پائی تھی۔ ہندوستانی مذاہب کے متعلق ان کے معلومات کا ماخذ اشخاص و مشاہدے تھے۔ انہیں نفسیات سے دلچسپی تھی اسی لئے انھوں نے شخصیات کو پیش نظر رکھ کر اپنے موضوع کا مطالعہ کیا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ باتیں عہدِ حاضر کے انسان کی بڑھتی ہوئی حرکت پذیری کی واضح مثالیں ہیں۔ یہ دونوں کتابیں مشرق کا سفر کرنے کے بعد ہی لکھی گئی تھیں۔ میں تو یہاں تک عرض کروں گا کہ کسی ایسی تاریخی ملت کے مذہب کا مطالعہ بھی شخصیات کے تعلق سے کیا جا سکتا ہے جس کا وجود اب باقی نہیں رہا۔

فرانکفورٹ کی تازہ تصنیف "قدیم مصریوں کا مذہب"[1] اس سے چالیس سال پہلے ارمان کی کتاب[2] اسی موضوع پر لکھی ہوئی پہلی یورپی تصنیف ہے۔ ارمان کے برخلاف، جس نے صرف معلومات کا مطالعہ کیا ہے، فرانکفورٹ نے ان مذاہب کے ماننے والوں کو بھی دھیان میں رکھا ہے[3]

---

[1] H. Frankfort, Ancient Egyption Religion: An Introduction (Newyark, 1948)

[2] Adolp Erman, Die Religion alten Aegypter (Berlin, 1905)

[3] فرانکفورٹ کو بھی احساس ہے کہ وہ ایک نئی راہ نکال رہے ہیں جس طریقہ سے میں اپنی موجودہ بحث پیش کر رہا ہوں وہ بھی اسی طرح کہتے ہیں: "ارمان نے .... ماہرانہ لیکن سرپرستی کے انداز میں پراسرار دیو مالا، عقائد اور رسوم کو بیان کیا ہے لیکن وہ مخصوص مذہبی اقدار جو ان باتوں میں مستور تھے، وہ ارمان کی نمایاں عقلیت پرستی سے پوشیدہ رہے .... اس کے بعد سے .... بہت سے مضمون آفریں مصنفوں نے .... ہمارے موضوع کے تعلق سے ایک عالم کی بجائے ایک سائنس داں کا نقطۂ نظر اختیار کر لیا بظاہر انہیں مذاہب سے بحث تھی لیکن دراصل وہ اس موضوع پر جمع شدہ گڈمڈ مواد میں نظم و ترتیب پیدا کرنے میں لگے ہوئے تھے اس مکتبِ خیال سے تعلق رکھنے والے حضرات اس موضوع پر پچھلے بیس تیس سالوں سے چھائے ہوئے ہیں ان کے پاس زیرِ مطالعہ مذاہب کے متون کے علم کا شاندار ذخیرہ ہے اور انھوں نے ہمارے معلومات میں زبردست اضافہ کیا ہے لیکن ان کی کتابیں پڑھتے ہوئے آپ کو یہ کبھی محسوس نہ ہوگا کہ یہ حضرات جن اللہ کا ذکر کر رہے ہیں، انھوں نے شاید ہی انسانوں کو اپنی عبادت کرنے پر آمادہ کیا ہوگا۔" (مقدمہ ص ۵، ۶)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

غالباً یہ بات زیادہ صحت کے ساتھ یوں کہی جا سکتی ہے کہ اقوام کی مذہبی زندگی کا مطالعہ صرف ان کے معبودوں کا نہیں بلکہ ان کے معبودوں کے ساتھ ساتھ ان کے اداروں اور ایسی ہی دوسری چیزوں کے مطالعے کا نام ہے۔ فرق طرز فکر و عمل اور طریقِ مطالعہ میں ہے۔ ہمیں مکرر یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ ظاہر یہ شاید ایک عالمانہ کتاب کی ضرورت برابر باقی چلی آرہی ہے۔ مصریات کے فاضل اجل ہونے کے باوصف اِرمآن اپنے مطالعہ میں ناکام رہے کیونکہ وہ مذہب کے ظواہر سے بحث کرتے رہے اور ان ظواہر ہی کو انھوں نے مذہب قرار دے لیا۔ ہمیں اسی کی حمایت کرنی چاہیئے کہ اب آئندہ کے لئے ظواہر کو ظواہر کا مطالعہ ہی تسلیم کیا جائے۔ صرف ایسے ہی مطالعات کو مذہب کے مطالعات مانا جائے جن میں اس حقیقت کو تسلیم کیا گیا ہو کہ وہ انسانوں کی زندگی سے متعرض و متعلق ہیں۔

پچھلے چند سالوں میں ہمارے مطالعات کو شخصیات سے مربوط کرنے کے ایک جز کا اظہار اس تبدیلی سے ہوتا ہے جو دنیا کے بڑے بڑے زندہ مذاہب سے ابتدائی دلچسپی لینے کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے ("زندہ مذاہب" کا محاورہ اب بہت عام ہو گیا ہے اور یہ بجائے خود قابل لحاظ ہے[1]) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس صدی کے ختم ہوتے ہوتے اس شعبۂ علم میں بطور نمونہ ایک تعارفی نصاب" مذاہبِ قدیمہ" پر زور دے گا۔ اور ایک خاص کتاب" مذہب کی ماہیت اور اس کی ابتدا کے موضوع پر لکھی جائے گی (یہ جملہ خود ہی اس بات کی دلیل ہے کہ مذہب

---

[1] مثال کے طور پر ایک تازہ تصنیف کا عنوان ہے: "دنیا کے زندہ مذاہب" مصنفہ سپگل برگ

F. Spegelberg: Living Religions of the world (Englewood Cliffs. N.J 1956) اسی طرح اور بہت سی کتابوں کے عنوان ملیں گے۔ آج کل کالج کی درسیات میں بھی اسی عنوان کے تحت نصاب سازی کا اہتمام ہو رہا ہے۔ مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاید اس صدی کے ختم ہونے تک عملی طور پر یہ محض کتاب کا عنوان نہیں رہے گا بلکہ خود نصاب کا نام ہو جائے گا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی اصلیت یا صداقت بالکل خالص حالت میں یا بالکل یقینی طور پر اپنی بالکل ابتدائی اور سادہ ترین شکلوں ہی میں ملتی ہے) آج کل تو یہ معمولی سی بات ہوگئی ہے کہ نصرانیوں اور یہودیوں کے ساتھ ساتھ ہندؤوں بدھیوں اور مسلمانوں پر خصوصی یا پوری پوری توجہ کی جا رہی ہے۔ ان مذاہب کے ماننے والے آج کی آبادی کے بہت وسیع طبقے ہیں۔[1] اور یہی وہ مذہبی گروہ ہیں جو بڑی شدت کے ساتھ مذہب کے

---

[1] یہاں بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ جرجی کی کتاب کا عنوان ایسا ہی توضیحی ہے:۔ Edward J. Jurji (Ed.) "The Great Religions of the Modern World (1946) جیسا کہ اس کتاب کے عنوان کے الفاظ سے ظاہر ہے۔ (یہ کتاب کئی بار چھپی۔ یہ ان کتابوں میں سے ایک کتاب ہے جس میں "قدیم" مذاہب کے بیان کو حذف کر دیا گیا ہے۔ کالج کی درسیات میں اسی نقطۂ نظر کی وضاحت کرنے والی بہت سی مثالوں میں سے ایک مثال یہ ہے: جامعہ شکاگو کے ڈی وی نٹی اسکول (شعبۂ الہیات) میں تجزیاتی اصولوں کے ایک تعارفی نصاب کے سوا "کامن کور" Common Core) کے زیر عنوان اس شعبہ میں ایک اور نصاب رکھا گیا ہے اس کو "ہم عصر عالمی مذاہب" کا نام دیا گیا ہے (302 .H. R سال ۵۷۔۱۹۵۸ء اور ۵۸۔۱۹۵۹ء کے اعلانات) حال حال تک اختصاص حاصل کرنے والا طالب علم کام کی انتہائی منزل میں مذاہب قدیمہ کا ایک نصاب منتخب کر سکتا تھا۔ اگرچہ یہاں بھی زیادہ ترقی یافتہ بڑے بڑے مذاہب کے مطالبات کے ساتھ ساتھ اسے ذیلی حیثیت دی گئی تھی۔ بڑے مذاہب میں خاص طور پر بدھ مت پر زیادہ زور دیا گیا۔ کیونکہ جامعہ شکاگو اس مذہب کے مطالعہ پر اپنی توجہات مرکوز کئے ہوئے ہے لیکن اسے بھی اب ختم کر دیا گیا۔ ظاہر ہے یہ اس لئے ختم کر دیا گیا کہ نصرانی اور مغربی نقطۂ نظر کے بالمقابل دوسرے عالمی مذاہب کا ایک نیا نصاب قابل ترجیح ہے (ملاحظہ ہو H. R. 341 سال ۵۷۔۱۹۵۸ء کے اعلانات اور اس کے ساتھ H. R. 342 برائے سال ۱۹۵۸ء - ۱۹۵۹ء) یہ تبدیلی وہ رسم کی تجدید کی طرف اگلا قدم ہے جس پر ہم اپنے مقالے کے دوسرے حصہ میں بحث کرنے والے ہیں۔ بڑے بڑے مذاہب کے بالمقابل مذاہب قدیمہ اور ان کے متعلقات سے ایسا ہی صرف نظر حال کی ایک شاندار تصنیف "انسان کے مذاہب" (Huston Smith The Religions of men, Newyark 1950) میں ملتا ہے یہ کتاب مذاہب کو اشخاص کا ایمان ہونے کی حیثیت سے پیش کرنے کی ایک تابناک مثال ہو۔ اس کتاب کے افتتاحی جملے پڑھیے جس میں لوگوں کو عبادت کرتے دکھایا گیا ہے۔ آگے اسی کتاب میں عبادت کرنے والوں کے مذاہب کو ان کی عبادات کے جوہر کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ دوسرے ابواب کے افتتاحی صفحات بھی ملاحظہ ہوں۔ بے شبہ یہ کتاب صاف سیدھے طور پر اس نکتہ کو تسلیم کرتی ہے یا کم از کم اس کی تصدیق کرتی ہے جس کی وضاحت میں اس مقالے میں پیش کر رہا ہوں کیونکہ مصنف نے اپنے مقدمہ میں واضح طور پر بتایا ہے کہ مذاہب سے متعلق معلومات کے لئے قاری کو دوسری (یعنی اس سے پہلے لکھی ہوئی) کتابوں سے رجوع کرنا چاہیئے۔ ان سے ہٹ کر مصنف کی یہ کوشش رہی ہے (باقی صفحہ ۱۸ پر)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سب سے اعلیٰ اور سب سے حقیقی ارتقار کی نمائندگی کے دعویدار ہیں اور جہاں کہیں بھی ہم نے بڑے مذاہب کی طرف اس حیثیت سے توجہ کی ہے وہاں بنیادی طور پر ہماری توجہ ان کی مقدس کتابوں اور ان کے ابتدائی کلاسکی عہدوں کی تاریخ کی طرف رہی ہے لیکن یہ ملحوظ رہے کہ آج کل ان مذاہب پر سب سے پہلے اس حیثیت سے نظر پڑتی ہے کہ وہ موجودہ انسانی گروہوں کا ایمان ہے ؎

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ ۔ کہ ان معلومات کی تعبیر و تشریح پیش کی جائے (ملاحظہ ہو کتاب کے پہلے باب کا پہلا حاشیہ ص ۲۱۵) غالباً یہ کتاب مذاہب عالم سے متعلق پہلی مناسب درسی کتاب ہے ۔ خاص طور پر اس لئے کہ اس میں مذاہب کی انسانی حیثیت سے بحث کی گئی ہے ۔

؎ جامعہ شکاگو کے نصاب کا پیش کش اور اسمتھ کی وہ کتاب ملاحظہ ہو جس کا ذکر اس سے پہلے کے حاشیہ میں آیا ہے ۔ عام قاریوں کے لئے جو چیزیں لکھی گئی ہیں ان کی مثالوں کے لئے وہ مقالے ہیں جو رسالہ " لائف " (نیویارک ، ۱۹۵۵ء) کے مختلف شماروں میں سلسلہ وار شائع کئے گئے ۔ بعد میں یہی مقالے ایک الگ کتابی صورت میں " دنیا کے بڑے مذاہب " (نیویارک ، ۱۹۵۷ء) کا عنوان دے کر شائع کئے گئے ۔ ڈچ زبان میں ان ہی مقالوں کا ترجمہ (De Gots dieus tan der World (1958) کے نام سے نکلا ۔ اس کتاب کے مقدمہ کا عنوان ہے " انسانیت کس طرح عبادت کرتی ہے ۔ یہ مقدمہ پال ہیچینسن (Paul Hucc hinoon "How Monkind Wor Ships P.P. 8) یہ مقدمہ خاص طور پر قابلِ لحاظ ہے ۔

علاوہ ازیں جامعہ ہارورڈ نے سنہ ۱۹۵۸ء میں اس شعبۂ علم کے لئے نئے نظام العمل کا افتتاح کرتے ہوئے جو عنوان اختیار کیا وہ تھا " نظام نامہ متعلق بہ ادیان عالم " حالانکہ پچھلے کئی دھوں سے اس شعبۂ علم پر " تاریخ مذاہب " یا " مذاہب کا تقابلی مطالعہ " جیسے عنوان چپکے ہوئے تھے ۔ جامعۂ ہارورڈ نے ان دونوں عنوانوں کو چھوڑ کر اپنے نئے نظام العمل کے لئے جو عنوان اختیار کیا وہ ظاہر ہے ان دونوں عنوانوں سے کوئی علاقہ نہیں رکھتا ۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

زندہ مذاہب کی صورت میں یہ حقیقت زیر مطالعہ مذہب سے متعلق تصور ہی کو متاثر نہیں کرتی بلکہ مطالعہ کے اس طریقے کو بھی متاثر کرتی ہے جو مطالعہ میں برتا جاتا رہا ہے۔ سب سے پہلا اہم نکتہ علمیات یعنی علم انسانی کے ذرائع اور مواد کا علم ہے۔ اپنے مذاہب کے سوا کسی دوسرے مذہب کے مطالعہ میں زیر مطالعہ مذہب کی اداری تنظیم، اس کی تشکیل اور اس کے پیروؤں کے اعمال کی تاریخ کا علم بے جان معروف مصادر سے حاصل کیا جا سکتا ہے لیکن اگر یہ مصادر زیر مطالعہ مذاہب کے پیروؤں کی زندگی کے شخصی اوصاف کا پتہ لگانے والی کلیدیں سمجھے جائیں تو پھر ان اوصاف کی ہمدردانہ تحسین کا ذریعہ کم از کم جزوی طور پر یہ ہے کہ خود زیر مطالعہ مذہب کے پیروؤں کو معلومات فراہم

لہ اس خصوص میں ایک واضح ارتقادہ کتابیں ہیں جو مغرب کے طالب علموں کے لئے مذہب کے تقابلی مطالعہ پر مارگن سلسلہ میں چھپی ہیں۔ اس میں خود ہندو، بدھی اور مسلم اپنے اپنے مذاہب کو پیش کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں جو کتابیں چھپی ہیں اُن کے نام یہ ہیں۔

Kenneth - W. Morgan (Ed) The Religion of Hindus (Newyark 1953)

The Path of Buddha: Buddhism Interpreted By Buddhists (New yark 1956)

Islam: The Straight Path: Islam Interpreted by Muslims (New yark 1956)

اس کے سوا اور بہت سی مثالیں اس بات کی ملتی ہیں کہ مغرب میں اس اصول کو تسلیم کرنے کا رجحان بڑھتا ہی جارہا ہے کہ یہ لگانے مذہب کو سمجھنے کے لئے خود اس مذہب کے پیروؤں ہی کو اس کی نمائندگی کا حق ملنا چاہیئے۔ اسی کی ایک مثال ایک مسلمان کے قلم سے نکلے ہوئے ترجمۂ قرآن کے سستے نسخے کی اشاعت ہے۔

The meaning of Quran An Explanatory Trans. by Mohammad Marmaduk Pickthall Newyark (Mentor Books, 1953

قرآن کے اس ترجمہ کے پیش لفظ کے یہ ابتدائی جملے (باقی صفحہ پر)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کرنے والے ہی نہیں بلکہ اپنا دوست سمجھا جائے ؔلہ متعلقہ شخص کے لئے ایک چیز جو کچھ معنی رکھتی ہے اس کے معلوم کرنے کے مختلف طریقوں میں سے ایک طریقہ یہ ہے کہ یہ بات خود اس شخص سے دریافت کرلی جائے۔

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ ملاحظہ فرمائیے۔ اس کتاب کا مقصد انگریزی پڑھنے والوں کے لئے قرآن کے وہ معنی پیش کرنا ہے جو پوری دنیا کے مسلمان مانتے ہیں۔ اس دعوے میں کافی وزن ہے کہ کسی مقدس صحیفے کی کامیاب ترجمانی ایسے سے ممکن نہیں جو اس کے پیام پر ایمان نہ رکھتا ہو" کتابوں کا ایک اور سلسلہ ہندوستانی ادب قدما کا لندن سے شائع ہونے والے ان نسخوں کا ہے جو رادھاکرشنن کی شرحوں کے ساتھ چھپے ہیں۔

The Bhagavadgita with an Introductiory Essay Sanskrit Text, English Translation and notes by S. Radhakrishnan (London 1948)

The Principal Upanisads, Edited with Introdution Text, Translation and notes By S. Radhakrishnan (London 1953) اس خصوص میں اور بہت سی کتابوں کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔

لہ اختلافات کئی لحاظ سے قابل غور ہیں۔ ان میں سے بعض اختلافات پر آگے "دعوت مقابلہ" کے تحت بحث کی گئی ہے۔ یہ اس اصول کو تسلیم کرنے کی طرف ایک اگلا قدم ہے کہ کسی مذہب کے پیروؤں ہی کو اپنے مذہب کی نمائندگی کرنی چاہیئے۔ یہ بھی بجائے خود کافی نہیں ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ یہ بات مدت ہوئی تسلیم کرلی گئی ہے کہ کسی مذہب کی پوری پوری وضاحت الفاظ میں ممکن نہیں۔ اس شخص سے بھی ممکن نہیں جو اس مذہب پر دل و جان سے ایمان رکھتا ہے۔ اس لئے جو کچھ اس کے قلب میں ہے اس کو سمجھنے کے لئے زیر نظر مذہب پر ایمان رکھنے والا جن باتوں کی تصدیق کرتا ہے ان کے سننے اور پڑھنے پر ہی طالب علم کو اکتفا نہیں کرنا چاہیئے بلکہ اس مذہب پر ایمان رکھنے والے کی زندگی کے ان صفات کو بھی جاننے کی کوشش کرنی چاہیئے یہ صفات شخصی روحی رابطے یعنی دوستی ہی کے ذریعہ جانے جا سکتے ہیں۔ یوں تو عمومی طور پر (باقی صفحہ ۲۱۷ پر)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مزید برآں کسی موضوع کے مخاطبوں کے تعلق سے ایک اور بات بھی قابلِ غور ہے۔ کسی کتاب کے لئے یہ سوال بہت اہم ہے کہ وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر آخر کس کے لئے لکھی گئی ہے۔ جو کچھ بھی

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ یہ بات تمام انسانی مباحث کے تعلق سے درست ہے لیکن مذہبی عقیدے کے متعلق خصوصی طور پر حق ہے۔ ایک شخص کے بارے میں دوسرے شخص کو جو معلومات حاصل ہو سکتے ہیں ان کا انحصار اصلاً اُن کے باہمی تعلقات پر ہوتا ہے۔ اس اصول کو تسلیم نہ کرنا انسان کو غلط سمجھنے کے مترادف ہے۔ میں اپنے ہمسایہ کو سرسری طور سے زیادہ نہیں جان سکتا اگر مجھے اس سے انس نہ ہو۔ جامعہ میک گل میں اس معاملہ کو اتنی زیادہ اہمیت دی گئی ہے کہ کسی مغربی طالب علم کو اسلام کے مطالعہ اور اسلامیات میں سند حاصل کرنے کی سہولتیں اس وقت تک فراہم نہیں کی جاتیں جب تک اُسے پڑھانے کے لئے مسلمان اساتذہ فراہم نہ ہوں۔ اس جامعہ کی یہ ایک باضابطہ حکمت عملی ہے کہ اس کے ادارہ دراسات اسلامیہ (Institute of Islamic Studies) میں آدھے اساتذہ اور آدھے طلبہ مسلمان ہونے چاہئیں۔ کسی مردہ مذہب کے لئے انتظامی حیثیت سے ایسا ضابطہ مقرر کیا نہیں کیا جا سکتا لیکن اصولاً اسے بالکل بے جا یا نامعقول نہیں کہا جا سکتا۔ پچھلے زمانہ کے مذاہب کی تمام تشریحوں کو اصولاً عارضی ہونی چاہئیے کیونکہ واقعتاً اُن کی تنقیح کا کوئی قطعی ذریعہ موجود نہیں ہو اس لئے جو کچھ معنی ان سے منسوب کئے جا رہے ہیں آیا وہ واقعی عمل پذیر بھی ہو رہے ہیں ؟ فرانکفورٹ نے مصر قدیم کے مذہب کی باز تعمیر کی جو کوشش کی ہے اس کا ذکر اوپر آ چکا ہے اس کوشش پر مصریات کے دوسرے ماہروں نے یہ تنقید کی ہے کہ فرانکفورٹ کی باز تعمیر جن معلوماتی بنیادوں پر قائم کی گئی ہے وہ ناقص ہیں۔ میں اس میدان کا مرد نہیں ہوں۔ اس لئے ایسے الزاموں کی معقولیت کا اندازہ نہیں کر سکتا۔ مجھے تو اس بات پر اصرار ہے کہ فرانکفورٹ اپنے خطبات کے ذریعہ جس بات کو پیش کرنے کی کوشش کر رہے تھے وہ صرف جائز ہی نہیں بلکہ لازمی ہے۔ اگر وہ اس کام کو اچھی طرح انجام نہ دے سکے تو دوسروں کو اس سے بہتر طور پر انجام دینا چاہئیے لیکن ہم اس نقطۂ نظر کو قبول نہیں کر سکتے کہ ایسی کوشش نہیں ہونی چاہئیے۔ جس طرح ادب، فن اور دوسرے انسانیاتی علوم میں تاریخی تنقید ایک متعارف چیز ہے۔ اسی طرح کئی ایسے ذرائع موجود ہیں جن سے مردہ قوموں کی ذہنی و قلبی کیفیات کا پتہ لگایا جا سکتا ہے۔ ان ہی ذرائع کا اطلاق (باقی صفحہ ۲۲ پر)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لکھا جاتا ہے اس کا تعین کچھ تو مصنف کے تجربے سے ہوتا ہے اور کچھ ان اشخاص کے تجربے سے جو اس کے مخاطب ہیں۔ ہماری دنیا کا اب یہ حال ہے کہ قومیں اور کتابیں دونوں ثقافتی سرحدوں کو پار کر کے آزادانہ طور پر اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر آنے جانے لگی ہیں۔ یہ نئی صورت حال مذہب کے تقابلی مطالعے کے موضوع پر لکھنے والے مصنفوں کو مجبور کر رہی ہے۔ جو کچھ وہ لکھ رہے ہیں اس کو شخصیتوں سے متعلق کر کے پیش کریں۔ جیسا کہ ہم اس سے پہلے عرض کر آئے ہیں، پہلے مغربی قاری کو اس موضوع پر لکھی ہوئی مغربی کتاب کسی بدیسی مذہب پر لکھی ہوئی کتاب معلوم ہوا کرتی تھی۔ لیکن اب روز بروز اسی قاری کو ایشیائی دوست ملتے جا رہے ہیں یا افریقہ کے بارے میں اس کے تجربات میں اضافہ ہو رہا ہے یا اس پر بین الاقوامی ذمہ داریاں عائد ہو رہی ہیں۔ دوسری قوموں کے مذاہب کے متعلق جو کتابیں طبع و شائع ہو رہی ہیں۔ ان کی طلب روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ ان کتابوں سے استفادہ کرنے والوں کی یہ طلب صرف علمی دلچسپی یا بے حاصل تجسس کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ یہ طلب اس لئے بڑھ گئی ہے کہ وہ ان قوموں کے اعمال کی تشریح و تعبیر چاہتے ہیں جن سے اب ان کا سابقہ ہے۔

علاوہ ازیں مغربی مصنفوں کی کتابیں جیسے بدھ مت پر لکھی ہوئی کتابیں ہیں انہیں روز بروز زیادہ سے زیادہ بدھی پڑھ رہے ہیں۔ ایسے قاریوں کا حلقہ جس درجہ وسیع ہو گیا ہے

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ: ان قوموں پر ہونا چاہیئے جواب زندہ ہیں لیکن اس صورت میں ان ذرائع کی تنقیح یا ان کا تکملہ خود اشخاص سے ربط کے ذریعہ کیا جا سکتا ہے اور اگر خود اشخاص قابل حصول نہ ہوں تب بھی میرا ایقان ہے کہ ہمدردانہ طرز عمل تمام انسانی اعمال کو سمجھنے میں ممد و معاون ثابت ہوتا ہے۔

میں یہ تو نہیں کہتا کہ اشخاص کے ذریعہ حاصل کیا ہوا علم بے خطا ہو۔ اس بات کا امکان ہے کہ معلومات پورے حاصل نہ ہوں یا معلومات غلط ہوں۔ متون اور دیگر ظاہری معلومات سے شخصی وضاحتوں کی تنقید اور ان میں ربط قائم کرنا چاہیئے۔ اشخاص کے ذریعہ معلومات کا طریقہ دوسرے مناہج کی جگہ نہیں لیتا۔ لیکن ہماری موجودہ دنیا میں یہ منہاج اس شعبۂ علم کا ایک لازمی جز بنے بغیر نہیں رہ سکتا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس کے مبنی بر واقعہ ہونے کا احساس مغربی مصنفوں میں سے چند ہی کو ہو سکا ہے اور ایسے مصنف تو بہت ہی کم ہیں جنھوں نے اس حقیقت کے نتائج کو پوری طرح محسوس کیا ہو۔ اب میں دو قضیئے پیش کرنا چاہتا ہوں جو قدرے جسارت آمیز ہیں۔ یہ قضیئے غالباً ابھی تک قاعدہ کے مطابق اور ضابطہ کے لحاظ سے مُحکّل نہیں ہوئے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود جاذب توجہ ضرور ہیں۔ میں یہ باور کرنے کی طرف مائل ہوں کہ ان کی اہمیت بڑھتی جا رہی ہے۔ میرا پہلا قضیہ تو یہ ہے کہ مذاہب کا تقابلی مطالعہ کرنے والے مصنف کے لیے دنیا کے سارے لوگوں کو مخاطب کرنے کے سوا کسی اور کے لئے لکھنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ اکثر مصنف یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اپنی کتابوں اور مقالوں میں ایک مخصوص ملّت (عام طور پر اپنی ہی ملّت) سے مخاطب ہیں۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ یہ کتابیں اور یہ مقالے دوسری ملّتوں کے افراد بھی پڑھتے ہیں اور خاص طور پر اس ملّت کے افراد پڑھتے ہیں جن کے متعلق یہ کتابیں اور مقالے لکھے گئے ہیں۔ مغرب یا نصرانیت یا عالمِ نصرانیت پر لکھی ہوئی مسلمانوں کی تحریریں جو عربی یا اردو یا کسی اور زبان میں مسلمانوں کے استفادے کے لئے لکھی جاتی ہیں مغربی عالم ان کا مطالعہ اور تجزیہ کر رہے ہیں اور اُن کے نتائج شائع کئے جا رہے ہیں۔ اس سے دو طرح کے نتیجے نکل رہے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس صورتِ واقعہ کی ایک حد تک حساس آگہی نے خود مسلمانوں کے طریقِ تحریر کو متاثر کرنا شروع کر دیا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس کی وجہ سے مغرب میں اسلام سے صریح اور واضح واقفیت کی جو کوشش ہو رہی ہے وہ بھی متاثر ہوئی ہے۔

یہ بات تو اور بھی بڑی حد تک صحیح ہے کہ مغربی علمار[1] کی لکھی ہوئی کتابوں کا مطالعہ وہ لوگ کر رہے ہیں

---

[1] غیر عالموں کی لکھی ہوئی تحریروں کا بھی یہی حال ہے۔ گو ان تحریروں سے ہمارا کوئی راست تعلق نہیں۔ اس کی ایک بہت نمایاں مثال وہ مضمون ہے جو رسالہ "ٹائم" میں "عالم اسلام" کے عنوان سے چھپا تھا۔ یہ مضمون اسلامی دنیا سے نہیں بلکہ فی الواقع دینِ اسلام سے متعلق تھا (ملاحظہ ہو رسالہ ٹائم ۱۳ راگست ۱۹۵۱ء ص ۳۲ - ۳۷) اس مقالے سے پورے عالمِ اسلام میں جو برہمی پیدا ہو گئی اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کچھ عرصہ تک کئی اسلامی ملکوں میں اس رسالہ کا داخلہ ممنوع قرار پایا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جن کے مذہب کے متعلق یہ کتابیں لکھی گئی ہیں روز بروز ایسے قاریوں کی تعداد میں اضافہ ہی ہو رہا ہے مثال کے طور پر ان مغربی عالموں کو لیجئے جو اہل مغرب کے لئے لادینی عقلیت کے علمی انداز میں اسلام کی شرح و تعبیر پیش کر رہے ہیں یا مہایانہ بدھ مت کے عروج کا تجزیہ کر رہے ہیں[1]۔ ابھی تک اس واقعہ نے صرف محدود آگہی پیدا کی ہے اور مذکورہ مغربی تحریروں کو تو بہت ہی محدود پیمانے پر متاثر کیا ہے لیکن یہ آگہی اس حد تک ترقی کر گئی ہے کہ اس کو محسوس کیا جانے لگا ہے[2]۔ اس آگہی میں مزید اضافہ ہونا چاہیئے۔ مغربی مصنفوں کی لکھی ہوئی کتابوں کا اثر مشرق پر بہت پڑا ہے اور یہ اثر بڑھتا جا رہا ہے

باقی

[1] بات یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ بیروت کے دو محنتی محققوں نے مسلمانوں میں نصرانیت کی تبلیغ کی تحریک سے متعلق تمام نصرانی مبلغوں کی تحریروں کی چھان بین کے بعد اپنی فرد جرم اس عنوان سے شائع کر دی ہے: "التبشیر والاستعمار فی البلاد العربیہ" تالیف مصطفےٰ خالدی و عمر فروخ (بیروت ۱۳۷۲ھ/۱۹۵۳ء)

[2] بطور مثال مانٹگمری واٹ کی تحریر کا ذکر اسی مقالہ کے حاشیہ نشان (۲۸) میں کیا گیا ہے۔

غیر ملکی ممبران ندوۃ المصنفین

اور

خریداران برہان سے ضروری گذارش

پاکستان اور دیگر ممالک کے ممبران ادارہ کی خدمت میں پروفارما بل ارسال کئے جا رہے ہیں۔ اُمید ہے فوری توجہ فرما کر ممنون فرمائیں گے۔

نیاز مند (مینجر رسالہ برہان دہلی)

© rasailojaraid.com